راہ روِ پشت بمنزل

دُنیا میں ہمیشہ دو قسم کے آدمی کام کرتے ہیں۔ ایک وہ جو حالات کو، جیسے کہ وہ فی الواقع ہیں، جوں کا توں تسلیم کرتے ہیں، اور انکے مطابق کام کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو حالات کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ انہیں کیا ہونا چاہیے، اور اس نقطۂ نگاہ سے وہ حاضر الوقت نظام پر تنقید کرتے ہیں۔ پہلا گروہ حال کی گاڑی کو چلاتا ہے، اور دوسرا مستقبل کی اصلاح و ترقی کے لیے راستہ صاف کرتا ہے۔ ان دونوں گروہوں میں تعاون ضروری ہے، مگر انکے تعاون کی فطری صورت یہی ہے کہ ان میں تصادم ہو۔

"کیا ہے" پر نظر رکھنے والے ہمیشہ حال پر فریفتہ ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے خوب ہو رہا ہے۔ اس میں کسی تنقید کی گنجائش نہیں۔ اور بالفرض اگر ہو بھی تو یہ وقت تنقید کا نہیں ہے، کیونکہ اس وقت تنقید کی جائیگی تو یہ یہ خرابیاں پیدا ہونگی، اور فلاں فلاں مصلحتوں کو ٹھیس لگ جائیگی۔ یہ سب باتیں وہ اس لیے کرتے ہیں کہ انکی نگاہ وقتی مصالح اور فوری فوائد میں اُلجھی رہتی ہے۔ عاجلہ کی محبت انہیں اتنی فرصت ہی نہیں دیتی کہ آجلہ کی فکر کریں۔ اُنکے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو کوئی وقت بھی تنقید کے لیے موزوں نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جس وقت جو کچھ بھی ہو رہا ہوگا خوب ہی ہو رہا ہوگا۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ وقتی مصلحتیں ٹھیس کھانے کو موجود ہونگی، ہر وقت ان مصلحتوں کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے وہ یہی کہینگے کہ ابھی تنقید کا وقت نہیں ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ وہ خود کبھی نہ بتا سکینگے کہ کونسا وقت تنقید کے لیے موزوں ہے۔

لیکن جنکی نظر "کیا ہونا چاہیے" پر ہوتی ہے۔ وہ چونکہ حالات کو ایک دوسری ہی نگاہ سے دیکھتے

ہیں، اسلیے وہ اسی وقت کو تنقید کے لیے موزوں سمجھتے ہیں جو "اہلِ حال" کے نزدیک سخت غیر موزوں ہوتا ہے۔ انہیں اپنا کام پرستارانِ عاجلہ کی چیخوں اور فریادوں، بلکہ گالیوں کے درمیان کرنا پڑتا ہے، کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کریں تو اصلاح و ترقی ناممکن ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ "جو کچھ ہو رہا ہے خوب ہو رہا ہے" کی ذہنیت عام لوگوں پر مستولی ہو جانے کے بعد کسی اصلاح کی ضرورت محسوس نہیں ہو سکتی خامیوں کا احساس یا تو پیدا ہی نہ ہوگا کہ انہیں دور کرنے کی طرف توجہ ہو، یا اگر تھوڑا سا احساس ابھرا بھی تو حال کے شیدائی اسے دبانے کے لیے بیسیوں قسم کی تاویلیں کریں گے، تاکہ ان خامیوں کو ناگزیر ثابت کریں اور بس چلے تو خوبیوں میں تبدیل کر دکھائیں۔

"کیا ہونا چاہیے" کے نقطۂ نظر سے جو تنقید کی جاتی ہے اسکا نتیجہ کبھی یہ نہیں ہوتا کہ حال میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ یک لخت بند ہو جائے، اور اُس وقت تک جمود و تعطل کی حالت طاری رہے جب تک کہ وہ مثالی (Ideal) حالت رونما نہ ہو جائے جسے مقصود قرار دے کر ناقد تنقید کرتا ہے۔ ایسا نہ کبھی ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ فطری طور پر تنقید کا اثر ہمیشہ بتدریج ہوا کرتا ہے۔ اول اول تو اسے سخت تلخی اور ناگواری کے ساتھ دیکھا جاتا ہے، کیونکہ عام طبیعتیں نقد سے مانوس اور نسبتہً نفور ہوتی ہیں۔ پھر ایک دور شبہات کا گذرتا ہے جس میں صداقت اور نیک نیتی کے سوا ہر ممکن چیز ناقد کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ اس کے بعد اگر فی الواقع تنقید میں کوئی جان ہوتی ہے اور درحقیقت حاضر الوقت نظام میں وہ خامیاں پائی جاتی ہیں جنکی نشاندہی تنقید میں کی گئی ہے، اور اگر عام لوگوں کی روح بھی حقیقت میں اسی معیار کو حق تسلیم کرتی ہے جسے مدِ نظر رکھ کر ناقد نے حال پر تنقید کی ہے، تب کہیں آہستہ آہستہ لوگ اصلاح کی ضرورت محسوس کرنی شروع کرتے ہیں، اور جوں جوں اصلاح کے حق میں رائے عام تیار ہوتی جاتی ہے، وقت کی قیادت پر دباؤ بڑھتا چلا جاتا ہے حتی کہ یا تو پچھلے قائدوں کو اپنی حالت اور اپنی پالیسی بدلنی پڑتی ہے، یا پھر تغیر پذیر حالات کے اقتضاء سے ایک نئی قیادت (Leadership) خود بخود نشو و نما پا کر سامنے

آجاتی ہے۔ اس عمل کے دوران میں کبھی تاریخ کی رفتار میں خلا یا شگاف واقع نہیں ہوتا کہ تعطل کی وہ حالت پیش آئے جسکی بھیانک تصویر کھینچ کھینچ کر "اہلِ حال" حضرات اصلاح و ترقی کی ہر کوشش کو سمِ قاتل ثابت کیا کرتے ہیں۔

کسی حالت کو مثال یا آئیڈیل قرار دے کر اُسکے لحاظ سے حاضر پر تنقید کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہم موجودہ حالت سے دفعتہً چھلانگ لگا کر اُس مثالی حالت میں پہنچ جانا چاہتے ہیں۔ کوئی صاحب عقل آدمی ظاہر ہے کہ ایسے طفرہ کا تصور بھی نہیں کر سکتا، کیونکہ تغیر بہرحال تدریجاً ہی ہوگا۔ مگر کسی صاحب عقل آدمی سے شاید یہ توقع بھی نہیں کی جا سکتی کہ وہ جس حالت کو مثال قرار دیتا ہو اُسکے بالکل برعکس حالت کی طرف جانے پر کسی درجہ میں بھی راضی ہو جائے۔ وہ اگر ذوی العقول میں سے ہے تو اس میں کم از کم اس بات کی طلب بلکہ تڑپ ہونی چاہیے کہ حالات کی رفتار اُسی منزل کی سمت میں ہو جسے وہ مقصود قرار دے رہا ہے، خواہ وہ ابتداءً چند قدم ہی کیوں نہ ہو۔ مثلاً اگر میرا خیال یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے خلافت راشدہ کے طرز کی قیادت، سیاست اور زندگی مثال کی حیثیت رکھتی ہے، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب جو مسلمانوں کا لیڈر ہو وہ فاروقِ اعظم سے کم نہ ہو اور اسکے ساتھی سب کے سب علی مرتضیٰ اور ابو عبیدہ بن الجراح اور عبدالرحمٰن ابن عوف کے مثیل ہوں۔ مگر اس کا مطلب یہ بھی نہ ہونا چاہیے کہ میری آخری منزلِ مقصود تو ہو وہ مقام جس پر صحابۂ کرام تھے اور اس منزل کی طرف جانے کے لیے میرے رہبر و رہنما ہوں وہ لوگ جو نہ اس راہ سے واقف ہیں، نہ اسکی طرف جانے کا ارادہ رکھتے ہیں، بلکہ اسکے عین مخالف سمت میں جا رہے ہیں۔

فرض کیجیے کہ میں سطح زمین سے دس ہزار فیٹ کی بلندی پر جانا چاہتا ہوں تو بہرحال میں وہی ذریعہ تلاش کرونگا جو مجھے اوپر کی طرف لے جا سکتا ہو، خواہ ابتداءً وہ مجھے دس فیٹ سے زیادہ نہ اُٹھا سکے۔ ایسا ذریعہ مجھے نہ ملیگا تو میں سطح زمین ہی پر قیام کرنا پسند کرونگا ــــ لیکن اگر آپ دیکھیں کہ

میں اوپر جانے کے ارادہ سے ایک برقی جھولے میں بیٹھ کر کسی کوئلے کی کان میں اترنا شروع کر دیتا ہوں اور اس راستہ سے اُس بلندی پر جانا چاہتا ہوں تو کیا آپکو میرے فاتر العقل ہونے میں ذرا سا شبہ بھی ہوگا؟ بالکل اسی طرح آپکو میرے فتورِ عقل میں اسوقت بھی کوئی شبہ نہ ہونا چاہیے جب آپ دیکھیں کہ میں اسلامی تہذیب کو زندہ کرنے اور فاروقی حکومت کے نصب العین تک پہنچنے کے لیے اُن لوگوں کے پیچھے چلا جا رہا ہوں جنکی عملی زندگی میں اور جنکے خیالات، نظریات، طرزِ سیاست اور رنگِ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی، جنکا حال یہ ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے مسائل سے لیکر بڑے سے بڑے مسائل تک کسی معاملہ میں بھی انہیں قرآن کا نقطۂ نظر نہ تو معلوم ہی ہے نہ وہ اسے تلاش کرنے کی ضرورت ہی محسوس کرتے ہیں[1]، جنکو نورِ ہدایت صرف مغربی قوانین و دساتیر ہی میں ملتا ہے، اُسی کی طرف وہ رجوع کرتے ہیں، اور اسکے بعد اگر کوئی چیز انکی نگاہ میں قابلِ لحاظ ہوتی ہے تو محض وقتی سیاست کی مصلحتیں جنہیں وہ خالص مادہ پرستانہ نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔

منزل مقصود وہ اور راستہ یہ! کون عقلمند یہ مان لیگا کہ اُس چیز کو مقصود قرار دینے والا انسان اِس راستہ پر قدم رکھنے کا خیال بھی کر سکتا ہے؟

پشت بمنزل چلنے والا تو خیر نادان بنکر چھوٹ سکتا ہے، مگر اس شخص کا معاملہ بڑا ہی عجیب ہے، جو اپنے ہی آئیڈیل سے ــــ جسکو وہ خود آئیڈیل کہتا ہو ــــ گھبرائے، اسکا نام سُن کر چیں بجبیں ہو جائے، اسکو پامال ہوتے دیکھ کر آفرین و مرحبا کے نعرے بلند کرے، اسکی حمایت کرنے والے کا منہ نوچنے کے لیے دوڑے، اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا جائے کہ آئیڈیل تو میرا وہی ہے۔ یہ آئیڈیل کی ایک بالکل ہی نرالی قسم

[1] اس عجائب کی دنیا میں جو عجیب باتیں سننے میں آتی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ "ہمارے لیڈر اگرچہ قرآن سے ناواقف ہیں مگر پھر بھی جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ عین قرآن کے مطابق ہے"۔ دوسرے الفاظ میں اسکا مطلب یہ ہے کہ نبوت ایک فضول چیز ہے، علم قرآن کے بغیر بھی آدمی اس صراط مستقیم پر چل سکتا ہے جو قرآن میں بتائی گئی ہے۔ حمیت جاہلیہ کی اس سے بدتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے!

دریافت ہوئی ہے جس سے ہم ابھی تک آشنا نہ تھے۔ ہمیں تو یہی معلوم تھا کہ آئیڈیل انسان کی محبوب ترین چیز ہوتی ہے۔ اس کا نام سُن کر دلوں میں حرارت پیدا ہونے لگتی ہے۔ اگر آدمی اس تک پہنچنے سے عاجز ہوتا ہے تو رنجیدہ اور غمگین ہوتا ہے۔ اگر کسی مجبوری سے اسکے خلاف چلتا ہے تو شرمندہ ہوتا ہے۔ اور اگر کہیں اس غلط روی پر اسے ٹوک دیا جائے تو اسکی نگاہ شرم کے مارے اٹھ نہیں سکتی۔ مگر اب ہمارا تعارف اس نئی قسم کے آئیڈیل سے ہوا ہے جو ہے تو آئیڈیل ہی، لیکن اسکا نام لے دیجیے تو چہرے بگڑنے لگتے ہیں، اس کی طرف چلنے کے لیے کہیے تو شدتِ غضب سے تیوریاں چڑھ جاتی ہیں، اسکے خلاف چلنے پر ٹوکیے تو شرمندگی کے بجائے کمال دیدہ دلیری و جسارت کے ساتھ تاویلیں کی جاتی ہیں، اسکی حمایت کرنے والے سے بڑھ کر نگاہوں میں کوئی مبغوض نہیں ہوتا، اور اسے پامال کرنے والوں سے بڑھ کر کوئی محبوب نہیں ہوتا۔ کیسا عجیب ہے یہ آئیڈیل اور کتنے عجیب ہیں اسکے پرستار!

طرفہ تماشا یہ ہے کہ کانگریس اور اسکے نیشنلزم کی مخالفت میں تو اسلام اور اسلامی کلچر کا نام لیا جاتا ہے، اور انہی ناموں کو نعرۂ جنگ بنا کر مسلمانوں کو اجتماع کی دعوت دی جاتی ہے۔ مگر جہاں یہ اسلام اور اسکی کلچر کا تحفظ کرنے والے جمع ہوتے ہیں وہاں اسی اسلام کے قوانین علانیہ توڑے جاتے ہیں، اسی کلچر کو ذبح کیا جاتا ہے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی ساری جنگ صرف اس لیے ہے کہ دوسروں کے ہاتھوں اسلامی کلچر کا جھٹکا نہ ہونے پائے بلکہ ہم خود اپنے ہاتھوں سے اس کو حلال کریں۔

وہاں "مسلمان" عورت اُسی طرح تبرّج جاہلیت کے ساتھ شمع انجمن بنی نظر آتی ہے جس طرح کوئی شریمتی جی یا کوئی بیگم صاحبہ ہو سکتی ہیں۔ وہاں عین نماز کے وقت جلسے ہوتے رہتے ہیں اور اگر بادلِ ناخواستہ ملتوی کیے بھی جاتے ہیں تو پیشواؤں سے لیکر پیروؤں تک شاذ و نادر ہی کوئی نماز کے لیے اٹھتا ہے۔ وہاں لباسوں میں، نشست و برخاست میں، دعوتوں اور پارٹیوں میں اسلامی کلچر کا کہیں نام و نشان تک نظر نہیں آتا، اور ایک معمولی مسلمان ان حامیان اسلام اور محافظین تہذیب اسلامی کی صحبت میں پہنچ

کر اپنے آپکو اتنا ہی اجنبی محسوس کرتا ہے جتنا ہندوؤں اور پارسیوں کی کسی محفل میں کر سکتا ہے۔ وہاں کے مباحث آپ گھنٹوں سنتے رہیں مگر بھولے سے بھی کہیں قرآن و حدیث کا ذکر نہ آئیگا، کسی مسئلے کا حل دریافت کرنے کے لیے اللہ اور اسکے رسول کی طرف رجوع نہ کیا جائیگا، بلکہ قرآن و سنت کا نقطۂ نظر صریح طور پر انکے سامنے رکھ دیا جائے تب بھی بلا تکلف اسکے خلاف طرزِ عمل اختیار کیا جائیگا۔ انکی کمیٹیوں اور انکے جلسوں میں آپ مسلمان کا ذکر کبھی اس حیثیت سے نہ سینگے کہ اس کا کوئی جماعتی نصب العین بھی ہے، وہ دنیا میں کوئی اخلاقی منصب بھی رکھتا ہے، اور کوئی الٰہی مشن بھی اسکے سپرد کیا گیا ہے۔ ان باتوں کے بجائے وہاں ساری گفتگو صرف اس حیثیت سے ہوگی کہ مسلمان کے نام سے جو ایک مجموعۂ افراد پایا جاتا ہے اسکو دنیوی نقصانات سے کس طرح بچایا جائے اور دنیوی فوائد سے کس طرح متمتع کیا جائے۔ پھر وہ لوگ جو اس طائفہ کے سرخیل ہیں ان کا حال کیا ہے؟ ان میں سے اکثر کے گھروں میں آپ جائیے تو آپکو نماز کے وقت کوئی یہ بتانے والا نہ ملیگا کہ سمت قبلہ کدھر ہے، اور اسبابِ عیش و عشرت سے بھری ہوئی کوٹھیوں میں سے ایک جانماز بھی فراہم نہ ہو سکیگی۔ سارے لیڈروں کو بٹھا کر اسلام کے بنیادی اور ابتدائی مسائل کے متعلق امتحان لیجیے تو شائد کوئی صاحب دو فی صدی سے زیادہ نمبر نہ لے سکینگے، الا ماشاء اللہ۔

کیا وہ اسلامی کلچر جسے کانگریس اور اسکی تحریک وطنیت سے بچانے کا دعویٰ کیا جاتا ہے، یہی ہے اور یہی اسکے تحفظ اور احیاء کے ڈھنگ ہیں؟ اور انہی طریقوں سے، ایسے ہی رہنماؤں کی قیادت میں اُس حکومت الٰہیہ تک پہنچا جائیگا جسے منتہائے نظر اور نصب العین قرار دیا جاتا ہے؟ — یہ سوال اتنا خطرناک ہے کہ اسے زبان پر لانا اپنی شامت کو خود دعوت دینا ہے۔ آپکی زبان سے اسلام اور اسکی کلچر کا ذکر سنتے ہی ہر طرف سے شور برپا ہوگا کہ یہ کیا صدائے بے ہنگام بلند کرنی شروع کر دی؟ آخر اس ذکر کا یہ کونسا موقع تھا؟ دیکھتے نہیں کہ ابھی ہم کلچر کی حفاظت کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ بھلا

جمع ہونے کے دوران میں بھی کہیں کلچر کا تحفظ کیا جاتا ہوگا؟

یہی دورنگی اور گندم نمائی وجو فروشی ہے جسے دیکھ کر غیروں کو یہ کہنے کا موقع ملتا ہے کہ اصل سوال محض معاشی وسیاسی ہے اور تہذیب و مذہب کو محض عام مسلمانوں کے جذبات برانگیختہ کرنے کے لیے بہانہ بنالیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حرکات کو دیکھ کر کون سمجھے گا کہ اپنے دین اور کلچر کی حمیت میں آپ واقعی مخلص ہیں۔ زبان سے کہیے کہ دل میں درد ہے، مگر ہاتھ سے بار بار پیٹ ہی کو بھینچے جائیے تو دیکھنے والا یہی خیال کریگا کہ درد آپ کے پیٹ میں ہے نہ کہ دل میں۔ ایسی ہی باتوں سے ایک قوم کی ہوا اکھڑتی ہے اور دوسری قوموں کے دل سے اسکا رعب اُٹھ جاتا ہے۔

تفرقہ وانتشار اور بے نظمی کے تلخ نتائج دیکھ کر مسلمانوں میں اجتماع و تنظیم اور مرکزیت کی ضرورت کا احساس تو پیدا ہوا، مگر افسوس کہ عقل و غور کی کمی نے اس مفید احساس کو بھی غلط راستہ پر لگا دیا۔ عام طور پر لوگ اب اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے جارہے ہیں کہ اجتماع اور تنظیم اور مرکزیت بجائے خود رحمت ہیں لہٰذا جو مرکز بھی سامنے آئے اسکے گرد جمع ہو جاؤ اور سب مل کر چلو، انشاء اللہ کہیں نہ کہیں پہنچ ہی جاؤ گے۔ گویا جس طرح کبھی یہ خبط پیدا ہوا تھا کہ "آرٹ محض آرٹ کی خاطر" اور "ادب محض ادب کے لیے"، اسی طرح اب یہ ایک نیا خبط پیدا ہو رہا ہے کہ "اجتماع بس اجتماع کی خاطر" اور "تنظیم محض بغرضِ تنظیم"، اور "مرکزیت صرف مرکزیت کے لیے"۔ حالانکہ ان چیزوں کے مفید ہونے کا تمام تر انحصار اجتماع کی روح اور تنظیم کے اصولوں اور مرکز کی نوعیت پر ہے۔ کسی غلط مرکز کے گرد بے مقصد جمع ہو جانا، یا غلط مقصد کے لیے جمع ہونا بجائے مفید ہونے کے اُلٹا مضر ہو جاتا ہے۔

مسلمانوں کو خوب اچھی طرح سوچ سمجھ کر سب سے پہلے یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ آخر انکا مطمح نظر کیا ہے اور وہ کس غرض کے لیے اجتماع اور تنظیم چاہتے ہیں۔

اگر آپ اصلی معنوں میں ایک ایسی مسلم جماعت کی تنظیم چاہتے ہیں جو اسلام اور اسکی تہذیب

کا تحفظ کر سکتی ہو اور بالآخر اسلامی حکومت کی منزل تک پہنچ سکتی ہو، تو آپ کو جان لینا چاہیے کہ جو صورت تنظیم اس وقت بن رہی ہے وہ بالکل غلط ہے۔ اِس تنظیم میں جو لوگ سب سے آگے کی صف میں نظر آتے ہیں، اسلامی جماعت میں ان کا صحیح مقام سب سے پیچھے کی صف ہے، بلکہ بعض تو وہاں بھی بمرعایت ہی جگہ پا سکتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کو پیشوا بنانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے ریل کے سب سے پچھلے ڈبے کو انجن کی جگہ لگا دینا۔ جس چڑھائی پر آپ جانا چاہتے ہیں، یہ نام نہاد انجن آپکی گاڑی کو اس طرف ایک انچ بھی لے کر نہیں چل سکتا، البتہ گاڑی اپنے وزن سے آپ ہی آپ نشیب کی طرف لڑھکے گی اور آپ لوگ کچھ مدت تک اس غلط فہمی میں مبتلا رہینگے کہ ماشاء اللہ ہمارا "انجن" اسے خوب اڑائے لیے جا رہا ہے۔ اس حقیقت کو جتنے جلدی سمجھ لیا جائے اتنا ہی بہتر ہے، کیونکہ ہر لمحہ جو گذر رہا ہے وہ آپ کو اوپر کے بجائے نیچے کی طرف لے جا رہا ہے۔ جو لوگ آپکی تہذیب کو جانتے ہی نہیں وہ اس کا تحفظ کیا کرینگے؟ جو اس سے علانیہ برسرِ بغاوت ہیں کس طرح امید کی جا سکتی ہے کہ انکے ہاتھوں سے اس کا احیاء اور ارتقاء ہو سکے گا؟ وہ اپنی زبان سے کلچر کلچر ضرور پکارتے ہیں، لیکن اگر حقیقت میں کلچر ہی کا درد انکے دل میں اٹھا ہوتا تو یقیناً انکی زندگیاں بدل گئی ہوتیں، انکی ذہنیتیں بدل گئی ہوتیں، اور انکا طرزِ فکر بدل گیا ہوتا۔ یہ علامت انکی زندگیوں میں ناپید ہے، اور یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ اس گروہ میں حقیقی اسلامی جذبہ ہرگز مشتعل نہیں ہوا ہے۔

اور اگر اسلامی نصب العین آپکے سامنے نہیں ہے بلکہ محض سادہ معنی میں ایک قوم کی حیثیت سے آپ اپنی انفرادیت کا تحفظ چاہتے ہیں، اور اپنے اندر نیشنلزم کی روح پیدا کر کے دوسری قوموں کے ساتھ کامیاب مسابقت کرنا آپکا آخری مطمحِ نظر ہے، تو بلاشبہ آپکو اپنے پیشواؤں میں اسلام کا رنگ دیکھنے کی ضرورت نہیں اور مجھے آپ سے کسی بحث کی ضرورت بھی نہیں۔ آپکا راستہ جدا ہے اور میرا راستہ جدا۔ البتہ میں وہی بات پھر کہونگا جو اس سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اپنی اس قوم پرستانہ

تحریک کے لیے آپ کو اسلام کا نام استعمال کرنے کا حق نہیں ہے کیونکہ اسلام ہر قسم کی قوم پرستی کا دشمن ہے خواہ وہ ہندوستانی قوم پرستی ہو یا نام نہاد مسلم قوم پرستی"۔

بعض حضرات اس قسم کے غیر اسلامی اجتماع اور مرکزیت کے حق میں قرآن و حدیث سے اس طرح استدلال کرتے ہیں کہ گویا یہی وہ "جماعت" ہے جس کے التزام کا حکم دیا گیا ہے اور جس سے الگ ہونے یا الگ رہنے پر جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔ لیکن میں حیران ہوں کہ اسے ناواقفیت کا کرشمہ سمجھا جائے یا خدا اور رسول کے مقابلہ میں جسارت۔ قرآن تو اس مسجد تک میں کھڑے ہونے کی اجازت نہیں دیتا جس کی بنیاد تقویٰ پر نہ ہو۔ اور یہاں تقویٰ کا نام لینے والے خبطی سمجھے جاتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ "اللہ کی رسی" کو سب مل کر مضبوط تھامو۔ اور یہاں کہا جا رہا ہے کہ بس سب لوگوں کا متفق ہو کر کسی رسی کو تھام لینا ہی ذریعہ نجات ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ اللہ کی رسی ہو یا نہ ہو۔ قرآن صاف کہتا ہے کہ

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ (المائدہ ۸)	مسلمانو! تمہارے حقیقی دوست اور ساتھی صرف اللہ اور رسول اللہ اور وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں، جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں، اور جو خدا کے آگے جھکنے والے ہیں۔

بلکہ یہاں تک کہتا ہے کہ

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ (التوبہ - ۲)	پس اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تب وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔

مگر یہاں نماز اور زکوٰۃ کی شرط کو محض بے معنی سمجھا جاتا ہے۔ برادری اور ولایت تو درکنار، امامت اور سرداری تک کے لیے یہ چیزیں شرط نہیں ہیں۔ بلکہ خدا کی مقرر کی ہوئی ان شرطوں کا نام لے لیجیے تو تیوریوں پر بل پڑ جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ احادیث میں التزام جماعت، اور طاعت امام کے متعلق جو احکام ہیں، اور من شذ شذ فی النار اور اسی قسم کی جو وعیدیں جماعت اور امام سے الگ ہونے والوں کو سُنائی گئی ہیں، انہیں کوئی واسطہ اُن جماعتوں اور اُن امامتوں سے نہیں ہے جو محض قوم پرستی کے اصول پر دنیوی اغراض کے لیے بنی ہوں۔ وہاں تو التزام جماعت سے مراد دراصل اُس جماعت کا التزام ہے جو دنیوی اغراض سے پاک ہو کر خالصتہً لوجہ اللہ اسلام کے مشن کی خدمت کے لیے بنی ہو۔ ایسی جماعت سے الگ ہونے کا نتیجہ یقیناً نارِ جہنم ہے اور ہونا چاہیے۔ مگر ان ہدایات کو دنیوی جتھے بندی اور سیاسی پارٹیوں کی وفاداری کے لیے دلیل بنانا خدا کے رسول پر بہتان گھڑنا ہے۔ کسی قوم کو کسی دوسری قوم کے مقابلہ میں اگر اپنی معاشی یا سیاسی اغراض کے لیے جدوجہد کرنی ہو تو وہ عام قوانین طبیعی کے مطابق اپنا جتھا بنائے اور قوت فراہم کرنے کی کوشش کرے۔ اسے خدا کو بیچ میں لانے کا کیا حق ہے؟ دو قوموں کی خالص نفسانی کشمکش میں آخر خدا کو جانب دار بننے کی کیا حاجت پیش آئی ہے کہ ایک کی جتھہ بندی سے الگ ہونے والوں کو تو وہ جہنم کی سزا نہ دے اور دوسری کے جتھے کو تقویت پہنچانے کے لیے وہ ہر اس شخص کے سامنے جہنم پیش کر دے جو اس سے الگ ہو یا الگ رہے؟

بعض لوگ اس دھوکے میں مبتلا ہیں کہ مسلمانوں کی اکثریت کا نام "سوادِ اعظم" ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی ہے کہ "سواد اعظم" کا ہمیشہ ساتھ دو، لہٰذا مسلمانوں کی اکثریت جس سیاسی پارٹی کی حامی اور جس قیادت کی متبع ہے اسکے ساتھ رہنا ضروری ہے۔ لیکن یہ ارشاد نبوی کی سراسر غلط تعبیر ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس سواد اعظم کے ساتھ رہنے کا حکم دیا ہے اس سے مراد دراصل اُن مسلمانوں کی اکثریت ہے جنکے اندر اسلامی شعور موجود ہو، جو حق اور باطل کی تمیز رکھتے ہوں اور جن کو اسلام کی روح اور اسکے بنیادی اصولوں سے کم از کم اتنی واقفیت ضرور ہو کہ اسلام اور غیر اسلام میں فرق کر سکتے ہوں۔ ایسے مسلمانوں کی اکثریت کبھی باطل پر مجتمع نہیں ہو سکتی، اور اگر وہ کبھی کسی

غلط فہمی میں مبتلا ہو بھی جائے تو اس پر زیادہ دیر تک جمی نہیں رہ سکتی - اسی بنا پر حضور نے سوادِ اعظم کا ساتھ دینے کی تاکید فرمائی - مگر جو لوگ ان ضروری صفات سے عاری ہوں اور جن میں کھرے اور کھوٹے کی بالکل ابتدائی پرکھ بھی نہ ہو انکے ہلڑ کا نام ہرگز اسلامی سوادِ اعظم نہیں ہے - نہ انکی جماعت اسلامی مفہوم کے اعتبار سے "جماعت" ہے - نہ انکی امارت اسلامی اصطلاح کی رو سے امارت ہے - نہ انکی اس امارت کو کسی حیثیت سے بھی سمع و طاعت کا حق پہنچتا ہے - محض لفظ مسلمان سے دھوکا کھا کر جو لوگ جاہلیت کی پیروی کرنے والوں کی تنظیم کو تنظیم سمجھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس نوعیت کی کوئی تنظیم اسلامی نقطۂ نظر سے مفید ثابت ہو گی انکی کند ذہنی ماتم کی مستحق ہے -

---